UPA
IMPACT FACTOR
5.473(SJIF)
UPA NATIONAL E-JOURNAL
Interdisciplinary Peer-Reviewed IndexedJournal
Special Issue :Volume -9 : Issue-1 (March-2023)
ISSN
2455-4375

گلزار کی کہانی " راوی پار" کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹرسراج انور

گلزار کی کہانیوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی ہر کہانی قاری کو متاثر کرتی ہےکیونکہ ان کا انتخاب موضوع بالکل منفرد ہوتا ہے۔ وہ کہانی کا تسلسل ایک ماہر کاریگر کی طرح برقرار رکھتے ہیں ان کی بنت میں کہیں بھی جھول نہیں آتا۔ کہانی کو وہ ایسی گرفتا عطا کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن ادھر ادھر نہیں بھٹکتا۔ کرداروں کے ساتھ تہ در تہ اترتا جاتا ہے۔

افسانہ راوی پار تقسیم کے بعد کا المیہ ہیں جس کا کلائمکس انتہائی حساس ہے۔ جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار درشن سنگھ ہے جو زندگی کے مختلف حوادثات سے گزر رہا ہے۔کہانی کی ابتدا میں ہی گلزار نے درشن سنگھ کے حالات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔"پتہ نہیں درشن سنگھ کیوں پاگل نہیں ہو گیا؟باپ گھر پر مر گیا اور ماں اس بچے کھچے گوردوارے میں کھو گئی۔۔۔اور شاہنی نے ایک ساتھ دو بچے جن دیئے۔دو بیٹے،جڑواں۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے کا سودا کیا تھا قسمت نے۔

یہ وہ حالات ہے جس کا تعلق براہ راست درشن سنگھ کی ذات سے منسلک ہیں۔ لیکن آگے چل کر پتہ چلتاہے کہ اسے مزید ایسے تکلیف دہ مسائل سے گزرنا پڑے گا جو اس کی روح تک کو زخمی کر دے گا۔ایک طرف جہاں آزادی ملنے کی خوشی تھی وہی دوسری طرف ہجرت کا معمہ بھی سر اٹھائے کھڑا تھاجہاں اپنے ہی وطن کے لوگوں کو اپنے ہی ہم وطن بھائیوں سے جان کا خطرہ لاحق تھا۔اندھی مذہب پرستی نے لوگوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی کہ لوگ اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرنے کو بھی دھرم سمجھ رہے تھے۔اپنی جان بچانے کے لیے مذہبی جگہوں کا سہارا لیا جا رہا تھا جو اس انسانی نفسیات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ انسان کے لئے مذہبی جگہ سے بہتر اور کوئی جائے پناہ نہیں ہو سکتی۔ نفرت اور غصے میں لوگ بھلے ہیجتنا اندھا ہو جائے لیکن بات جب مذہب یا مذہبی جگہوں کی آتی ہے تو اسے سر خم تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔آزادی حاصل کرنے کی خوشی تو مل چکی لیکن فسادات کی وجہ سے لوگ خصوصاً ہندو سکھ سب سے چھپتے چھپاتے گوردوارے میں جمع ہو رہے تھےجب درشن سنگھ فسادات سے متعلق کوئی خبر لاتا ہے تو اس کا باپ ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتا ہے کہ "کچھ نہیں ہو گا بیٹا۔ کچھ نہیں ہو گا۔ابھی تک کسی ہندو سکھ کے مکان پر حملہ ہوا ہے کیا؟ " اس جملے کے ذریعے ایک باپ جو اپنے گھر کا سربراہ ہوتا ہے نگہبان ہوتا ہے اور اپنے خاندان کو سنبھالے ہوتا ہے اس کی جذباتی کیفیت کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ صد فیصد نبھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔وہیں دوسری طرف درشن سنگھ اپنی بے اطمینانی کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے کہ"گوردوارے پر تو ہوا ہے نہ بھاپاجی۔ دو بار آگ لگ چکی ہے اور تم لوگ وہیں جا کر جمع ہونا چاہتے ہو؟"اس مقالمہ کے ذریعے گلزار نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اب انسان کے لیے مذہبی جگہوں کا تقدس بھی برقرار نہیں رہا ہے وہ نفرت کی آگ میں اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ خدا اور انسان اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

بھاپاجی اپنے ہی گھر میں حادثاتی موت کا شکار ہوجاتے ہیں تو درشن سنگھ کے پاس گردوارے میں پناہ لینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا کہ یہاں بھی خوفزدہ لوگوں کی کمی تو نہیں تھی لیکن حوصلہ تھا، اب اسے ڈر نہیں لگتا۔ وہ کہتا ہے۔"ہم اکیلے تھوڑا ہیں اور کوئی نہیں تو واہگرو کے پاس تو ہیں۔" یہاں بھی گلزار نے اانسانی نفسیات کا اظہار کیا ہے کہ جب اسے اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے تو وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے اور کوئی بھی مصیبت کا سامنا وہ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب انسان کی جان کے لالے پڑے ہو اور پناہ کے طور پر مذہبی جگہ ہو تو اس کا ایمان و عقیدہ اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔

گرودوارے میں دن رات لنگر چلتا ہے۔ مگر کب تک؟ یہ سوال سب کے دل میں تھا اور لوگ امید لگائے بیٹھے تھے کہ سرکار انہیں ضروری مدد پہنچائی گئی اس پر ایک شخص کہتا ہے کہ "کونسی سرکار؟ انگریز تو چلے گئے۔یہاں پاکستان تو بن گیا ہے لیکن پاکستان کی سرکار نہیں بنی ابھی۔ لوگوں کو وطن کے بٹوارے کے نام پر تقسیم تو کر دیا گیا لیکن ان کے مسائل پر

کسی بھی طرح کی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ملک کا انتظام درہم برہم ہوچکا ہے"۔ موقع پرست سیاستدانوں نے اپنے اپنے فائدے کے لئے لوگوں کی بلی چڑھادی ہیں انہیں کسی کی پرواہ نہیں کہ لوگ جئے یا مرے۔ لوگ تو ہجرت کے نام سے ہی

نابلد تھے تو انہیں شرنارتھی یا ریفیوجی جیسے لفظوں سے بھلا کیا لینا دینا۔ ملاحظہ ہو۔"سنا ہے یہاں ملٹری گھوم رہی ہے ہر طرف۔ اور اپنی حفاظت میں شرنارتھیوں کے قافلے بارڈر تک پہنچا دیتی ہے۔"

"شرنارتھی؟... وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ریفیوجی"

"یہ لفظ تو پہلے کبھی نہیں سنا تھا"۔

فساد و دہشت نے جب افرا تفری کا ماحول پیدا کردیا تو لوگ ہجرت کے لئے نکل پڑیں۔

دل پر پتھر رکھ کر ایک شخص کہتا ہے کہ "ہمت تو کرنی پڑے گی بھئی۔ واہگوروں موہنڈوں (کندھوں) پر تو بٹھا کر نہیں لے جائے گا نا؟ دوسرا شخص گروبانی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "نانک نام جہاز ہے، جو پڑھے سو اترے پار"۔ اور اس طرح لوگ اس کرب کو برداشت کرتے ہوئے ٹرین پر سوار ہو جاتے ہیں جہاں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہوتی۔اسی اثنا میں درشن سنگھ کی بیوی شاہنی اپنے جڑواں بیٹوں کو جنم دیتی ہے جن میں ایک بہت ہی کمزور پیدا ہوتا ہے جسے وہ اپنی نابھی (ناڑی) کے زور سے باندھے ہوئے رکھتی ہے۔جب ریفیوجی کو لینے اسپیشل ٹرین کی خبر ملتی ہے تو درشن سنگھ اپنی بیوی اور ماں کو چلنے کے لیے آمادہ کرتا ہے لیکن وہ انکار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ "میں آ جاؤں گی بیٹا۔ اگلے کسی قافلے کے ساتھ آ جاؤں گی۔ تو بہو اور میرے پوتوں کو سنبھال کا نکل جا"۔گلزار کی کہانی کا کا یہ جملہ بڑا ہی دلسوز ہے ایک ماں جو کسی بھی صورت میں اپنے بچے سے الگ ہونے کا نہیں سوچ سکتی، جب اسے اس بات کا اچھی طرح علم ہو جاتا ہے کہ وقت ایسا آن پڑا ہے جہاں اپنی ہی جان بچانا مشکل ہے تو وہ اپنے بیٹے درشن سنگھ کے لیے اور مصیبت نہیں کھڑا کرنا چاہتی اور اپنے بیٹے کے خاندان کے لیے اپنی جان کا سودا کر بیٹھتی ہے۔درشن سنگھ گرنتھی اور سیواداروں کے سمجھانے پر اسٹیشن کی طرف چل پڑتا ہے جہاں لوگوں کا بے تحاشا ہجوم ہوتا ہے لیکن شاہنی اور اس کے نومولود بچوں کو دیکھ کر گاڑی کی چھت پر لوگ اسے جگہ دے دیتے ہیں۔دونوں بچے ماں کی سوکھی چھاتیوں کو چچوڑتے رہتے ہیں جہاں نہ دودھ ہوتا ہے نہ پانی، وہ ایک بچے کو رکھتی ہے تو دوسرے کو اٹھا لیتی ہے۔ کچھ گھنٹوں کا سفر طے کرنے کے بعد درشن سنگھ کی نظر جب ایک بچے کی طرف پڑتی ہے تو پاتا ہے کہ وہ پوری طرح ساکت ہے اور اس کا جسم مکمل طور پر ٹھنڈا ہو چکا ہے۔درشن سنگھ پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے اور شاہنی اس صدمے سے پتھرا جاتی ہے۔ ٹرین مختلف جگہوں پر رکتی ہے اور شاہنی اس مرے ہوئے بچے کو اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے رکھتی ہے۔ جب ٹرین راوی کے پل سے گزرتی ہے تو ایک ساتھی مسافر درشن سے کہتا ہے کہ سردار جی مرے ہوئے بچے کو کب تک ساتھ رکھو گے یہی سے پھینک دو دریا میں کلیان ہو جائے گا۔ اس پار لے جا کر کیا کرو گے؟ درشن سنگھ پوٹلی اٹھا تا ہے اور واہیگرو کہہ کر راوی میں پھینک دیتا ہے۔

اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دیتی ہے کسی بچے کی۔ جسے سن کر درشن سنگھ گھبرا جاتا ہے اور شاہنی کی طرف دیکھتا ہے جہاں مردہ بچہ شاہنی کی چھاتی سے لپٹا ہوا ہوتا ہے اور لوگ نعرے لگا رہے ہوتے ہیں کہ واگھا آگیا۔ واگھا آگیایہاں کہانی کا اختتام تو ہو جاتا ہے لیکن دل مسوس کر رہ جاتا ہے اور ذہن ایک لمحے کے لیے سن ہو جاتا ہے۔ جہاں قاری درشن سنگھ کے درد کو اپنے اندر محسوس کرتا ہوا پاتا ہے۔

کہانی کے پس پشت گزارنے اس کہانی کے ذریعے یہ پیغام بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ انگریزوں سے تو ہم نے آزادی حاصل کر لی لیکن آزادی کی سرحد پار کرتے ہوئے ہم نے بھی زندہ قدروں کو پھینک دیا اور نفرت، دہشت اور تعصب و تنگ نظری کی مردہ لاش جس کو ہمیں ترک کر دینا چاہیے تھا وہ ابھی تک ہمارے گلے سے لگی ہوئی ہے اور جس کو خوشگوار اختتام سمجھ رہے ہیں اصل وہ ہمارا المیہ ہے۔

راوی پار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں، نہ شاعرانہ منظرنگاری ہے نہ الفاظ کی بھرمار، مکالموں کا استعمال بھی حسب ضرورت کہانی میں رکھا گیا ہے جس سے کہانی پن کی چاشنی اور اس کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ کہانی کا موضوع راوی پار تقسیم کے بعد کا المیہ ہے جس نے کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کو حد درجہ متاثر کیا تھا۔
افسانہ نگار کا سماج کے تئیں یہ فرض بنتا ہے کہ وہ زندگی کے ایسے المناک پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی سعی کریں۔راوی پار میں گلزار نے یہ فرض بخوبی نبھایا ہے

DR. Siraj Anwar

Assistant Professor
Govt.Vidarbha Institute of Sceince& Humanities, Amravati
Email: sirajj007@gmail.com
Mob: 8668323359